

پہلو سے یہ لوگ بھی ایک غیر اسلامی نظام حکومت میں بادشاہی کے منصب پر فائز تھے دوسری طرف ان کی ذاتی خدا ترسی، تقویٰ اور احساس ذمہ داری، انہیں کسی غیر اسلامی فعل سے روکتی اور قانون شریعت کے اجراء و نفاذ پر آمادہ کرتی رہتی تھیں۔ اس طرح پرانے نیک بندوں نے اس نظام کے اندر رہتے ہوئے گویا دو متناقض چیزوں کے درمیان سمجھوتہ کی کوشش کی۔ اس میں یہ کہاں تک کامیاب ہوئے، تاریخ کے صفحات اس کا جواب دیں گے۔ اسلامی تحریک کی تاریخ میں بہر حال ان کا ایک مقام ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ ۱۱۱۴ھ - ۱۱۷۴ھ | اب ہم بارہویں صدی کے حدود میں داخل ہو رہے ہیں۔ اورنگ زیب کی وفات ۱۱۱۸ھ میں ہوئی۔ وہ جسے ہندوستان میں "ناموس ملت کا آخری پاسبان" کہا جاتا ہے، اس کے جانشین ایسے کمزور اور بوسے ثابت ہوئے کہ نصف صدی کے اندر اندر دیکھتے دیکھتے مغل حکومت کا اقتدار جاتا رہا۔ نظم و نسق حکومت میں بالکل اتہری پیدا ہو گئی۔ ہر طرف بغاوت اور خود مختاری کا جھنڈا بلند ہونے لگا۔ مختلف صوبوں میں مقامی سیاسی طاقتیں سر اٹھنے لگیں۔ پھر ان سیاسی طاقتوں کے ساتھ مقامی تہذیبوں نے بھی بال و پر لگانا شروع کیے۔ اور وہ سب بدعات اور منہدانہ رسوم جو اورنگ زیب کی کوششوں سے دب گئے تھے، از سر نو منظر عام پر آنے لگے۔ شیعیت بھی آخری کمزور بادشاہوں کی سرپرستی میں پھر سر چڑھنے لگی۔ عام مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کی طرف نہ پہلے توجہ کی گئی اور نہ اب۔ اپری قومی حکومت و امرائے حکومت کے سہارے جیتی رہی۔ جوں ہی حکومت کمزور ہوتی نظر آئی، ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا اچھانے لگا۔ علماء اور صوفیہ کی روش میں بھی کوئی خاص تبدیلی نہیں پیدا ہوئی۔ مدرسوں کا نظام تعلیم اسی پرانے ڈگر پر چلتا رہا۔ کتاب و سنت سے بے پروائی اپنے حال پر قائم رہی۔ خلاصہ یہ کہ ایک طرف چھ سات سو برس کی رچی بسی ہوئی خرابیاں تھیں۔ دوسری طرف ایک فقیر اور ایک شہنشاہ کی کوششیں۔ اگر اورنگ زیب کے جانشین جاندار اور ہوشمند ہوتے تو شاید اصلاح و تجدید کا یہ ارتقاء جاری رہتا۔ مگر ان کی کمزوری اور نااہلی نے نقشہ ہی بدل دیا۔ حالات

بد سے بدتر ہو گئے اور پھر ایک مصلح و مجدد کی شدت سے ضرورت محسوس ہونے لگی۔

ان حالات اور اس ماحول میں شاہ ولی اللہؒ نے آنکھیں کھولیں اور سقّٰی رشد کو پہنچتے ہی ازبرِ نو اصلاح و تجدید کا بیڑا اٹھایا۔ ان کے سامنے مکمل دین تھا اور اسے تمام پہلوؤں سے اُجاگر کرنا چاہتے تھے۔ پوری اسلامی تاریخ کا جائزہ اور غیر اسلامی افکار کی تنقیح و تنقید بھی ان کے مشن کے اہم اجزاء تھے۔ اس عظیم الشان کام کے لیے جس علم اور غم و محنت کی ضرورت تھی، وہ انہیں پوری طرح حاصل تھی۔ ہم ان کے کارناموں کو حسب ذیل موٹی موٹی قسموں میں بیان کر سکتے ہیں:-

(۱) ہمایوں کے زمانے ہی سے شیعیت کا زور شروع ہو گیا تھا اور دن بدن بڑھتا ہی رہا۔ شاہ صاحبؒ نے ازالۃ الخفا لکھ کر عملی طور پر یہ محبت تمام کر دی، نیز اسلامی حکومت کی خصوصیات اُجاگر کیں۔

(۲) اب تک علماءِ علمِ کلام ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے۔ شاہ صاحبؒ نے انہیں حدیث و فقہ کی طرف توجہ دلائی اور اسرارِ شریعت پر حجتہ اللہ البالغہ لکھ کر ان کے خیالات کی تصحیح کی۔

(۳) بارہویں صدی ہجری سے پہلے ہندوستان کے علمی و دینی حلقوں میں قرآن کریم کی تعلیم گویا نصاب سے خارج تھی۔ انہوں نے اصولِ تفسیر میں ایک گراں قدر کتاب الفوز المکیہ لکھ کر کتاب اللہ کے درس و مطالعہ کی دعوت دی۔ ساتھ ساتھ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ کر کے عام لوگوں کے لیے قرآن پڑھنے اور سمجھنے کی راہ کھول دی۔

(۴) تقلید جامد کے خلاف آواز بلند کی اور تحقیق و اجتہاد کے عملی نمونے پیش کیے۔ نیز مجتہدین کے باہمی اختلافات پر روشنی ڈالی اور ائمہ کے مختلف فیہ اقوال کے درمیان تطبیق کی کوشش کی۔ حجتہ اللہ البالغہ اور الانصاف میں اس باب کے خاص مباحث ہیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے ذہن خود بخود کتاب و سنت کی طرف مائل ہوتا ہے اور طبیعت تقلید جامد سے اِبا کرتی ہے

(۵) حدیث نبویؐ کا خزانہ عام کرنے میں اپنی زندگی کا بڑا حصہ صرف کیا۔ مؤطا امام مالکؒ

کی عربی و فارسی میں دو شرحیں لکھیں، اور دوسری چھوٹی تصنیفات کے علاوہ اپنے پیچھے شاگردوں کا ایک ایسا سلسلہ چھوڑ گئے جن کے فیضِ علم سے ہندوستان کا چپہ چپہ ”حَدَّثَنَا“ اور ”أَخْبَرَنَا“ کے ہمہوں سے گونج اٹھا۔

صاحبزادے اور شاگرد | شاہ صاحب کی خوش نصیبی سے اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسے باکمال فرزند اور شاگرد عطا فرمائے، جو ان کے بعد ان کے مشن کی تکمیل میں لگے رہے اور پھر انہی کی تعلیم سے ناسر ہو کر اور انہی کے خاندان میں وہ سر فرخس مجاہد بھی پیدا ہوئے، جنہوں نے شہادتِ حق کی راہ میں اپنے جان و تن کی بانی لگانے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ ان کے چاروں صاحبزادے، شاہ عبدالعزیز (۱۲۳۹ھ)، شاہ رفیع الدین (۱۲۳۳ھ)، شاہ عبدالقادر (۱۲۳۵ھ) اور شاہ عبدالغنی (۱۲۳۶ھ) سب کے سب یگانہ روزگار اور مرجع خواص و عوام تھے۔ ان کے دم سے ہندوستان میں کتاب و سنت کا چرچا بٹھا۔ ان کی تصنیفات اب تک علماء اور طلبہ کا مرجع و ماخذ ہیں۔ شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ قرآن آج تک معیاری اور اپنی آپ مثال ہے۔ اسی طرح ان کے نو اسے شاہ محمد اسحق (۱۲۶۲ھ) نے بھی ایک مدت تک مسندِ ولی اللہی کی روایات قائم رکھیں اور ان کے چشمہٴ علم سے عرب و عجم کے ہزاروں افراد سیراب ہوئے۔ شاہ صاحب کے صاحبزادوں میں صرف چھوٹے بیٹے شاہ عبدالغنیؒ نو عمری ہی میں وفات پا گئے۔ اور اس لیے انہیں اپنے دوسرے جانیوں کی طرح کام کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ لیکن قدرت کے اندازِ نرلے ہیں۔ ان کے صلب سے وہ یگانہ روزگار مجاہد پیدا ہوا جس نے دادا کے ادھورے کام کی تکمیل کی اور اسلامی ہند کی تاریخ پر ایسا نشان چھوڑ گیا جو رہتی دنیا تک مٹ نہیں سکتا۔ آگے کی سطروں میں ان کے کارناموں کی طرف ضروری اشارے آتے ہیں۔

شہیدین | اب تو یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلامی ہند میں اصلاح و تجدید کی ابتدا حضرت مجددِ مہرِ ہندی سے ہوئی۔ شاہ صاحب نے ان سے آگے بڑھ کر ایک مکمل فکری و علمی تجدید و انقلاب کی داغ بیل ڈالی۔ لیکن خود وہ انقلاب برپا نہ کر سکے۔ ان کی عمر کا بڑا حصہ ذہنوں کی صفائی اور افکار و نظریات کی تنقیح و تنقید میں بسر ہوا۔ یہ کوئی سیرتِ انگیزہ بابت نہیں۔ قوموں کی تاریخ میں ایسا ہوتا آیا ہے۔

شاہ صاحبؒ کی وفات کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ان سے تعلق رکھنے والوں اور خود انہی کے خاندان میں، ایسے اللہ کے بندے نکل آئے جنہوں نے ان کے مشن کی تکمیل کی۔ دعوت حق کا پرچم بلند کیا اور اس سرزمین میں پہلی مرتبہ اقامت دین کی تحریک برپا کی۔ میری مراد سید شہد بریلویؒ (۱۲۰۱ھ - ۱۲۴۶ھ) اور ان کے جہاں نثار رفیق مولانا اسماعیل شہیدؒ (۱۱۹۳ھ - ۱۲۴۶ھ) سے ہے۔ حق یہ ہے کہ ان شہیدانِ راہ حق اور ان کے ماننے والوں اور ان کے نقش قدم پر گھر بار لٹانے والوں نے اس ملک میں ایک باوجود صحابہؓ کی یاد تازہ کر دی۔ ان کا مقصد اللہ کے دین کو غالب کرنا اور اُس کی شریعت کو اُس کی زمین پر نافذ کرنا تھا۔ اور اس مقصدِ عظیم کے لیے انہوں نے ہر ممکن قربانی کی۔ بنگال سے لے کر سرحد اور ماورائے سرحد تک، زمین کا چپہ چپہ ان کی قربانیوں اور فداکاریوں پر گواہ ہے۔ چرخِ کج رفتار ان شہیدانِ راہ حق کے کارناموں کو بھلانا بھی چاہے تو کیسے بھلائے؟

ہرگز نمیر و آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق

ثبت است بر حسبِ یدۃ عالم و دایم ما

اس تحریک تجدید و جہاد کے بارے میں اتنا عرض کر دینا کافی ہو گا کہ یہ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک تھی جو صحیح اسلامی نصب العین کو سامنے رکھ کر شروع کی گئی اور آخر دم تک اپنے مقصد پر قائم رہی۔ اس کی برکت اور اس کے علم برداروں کے دم قدم سے توحید و سنت کا جو بول بالا ہوا اور بدعات و شرکاتہ رسوم کا جس طرح استیصال ہوا، اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں مختصر یہ سمجھیے کہ آج اس برصغیر ہندوستان میں ایمان و عمل کی جو بُری بھلی متاع پائی جاتی ہے وہ انہی مردانِ حق کا فیض ہے اور انہی کے آفتابِ علم و عمل کا پرتو۔

یہ خیال صحیح نہیں کہ مشہدِ بالا کوٹ کے بعد یہ تحریک ختم ہو گئی۔ اور اب تو یہ کوئی دھکی چھپی حقیقت نہیں کہ سید صاحبؒ کی شہادت، یعنی ۱۲۴۶ھ سے لے کر بیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک سید شہیدؒ کے ماننے والے اور اس تحریک سے وابستگی رکھنے والے پوری طرح سرگرم عمل رہے اور برطانوی پولیس اور فوج کی تمام چنگیز سامانیوں کے باوجود اپنا فرض انجام دیتے رہے۔

۸۵۷ | ابھی سید صاحب کی تحریک ملک کے اندر اور باہر منظم طریقہ پر جاری تھی کہ سید کا وہ خوئی انقلاب رونما ہوا، جس نے اس ملک کی کایا ہی پلیٹ دی۔ مسلمان اس مہم میں آگے آگے تھے اور حکومت انہی کے ہاتھوں سے گئی تھی، اس لیے وہی اس انقلاب کا خاص طور پر شکار ہوئے۔ بدیسی حاکموں نے انہیں سیاسی اور معاشی طور پر ختم کرنے کا تہیہ کر لیا اور طرح طرح کی آزمائشوں اور مشکلات میں ڈال کر ان کا وجود و عدم برابر کرنے کی کوشش کی۔

دینی حیثیت سے بھی اس انقلاب کے نتائج کم خطرناک نہیں ثابت ہوئے۔ وہ قوم جو ہمیشہ حکومتوں کے سہارے جیتی رہی اور بس کی تعلیم اور اخلاقی تربیت کا کبھی کوئی باقاعدہ انتظام نہیں کیا گیا، اور جس کے ذمہ دار اور مرقہ الحال طبقے کی بنیادی کمزوریاں پچھلی صدی کی کشمکش میں پوری طرح ظاہر ہو چکی تھیں، اس سے یہ توقع ہی کب تھی، کہ وہ انقلاب اور اس کے خطرناک نتائج کا مردانہ وار مقابلہ کر سکے گی؟ نتیجہ ظاہر تھا۔ ایک افراتفری پیدا ہوئی۔ ایک طرف سے ”چلو تم اُدھر کو ہو اُدھر“ کی ”کالعرہ بلند ہوا۔ فرنگیت نوازی کا یہ نعرہ زندگی کے کسی ایک شعبے تک محدود نہیں رہا تعلیم و تربیت سے لے کر مذہب و اخلاق تک سب اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ ہمیں یہاں خاص طور پر دینی افکار سے بحث ہے۔ سرسید اور اس کے ہمناظرین نے اس سلسلے میں جو غلطیاں کیں، آج تک ان کی تلافی نہیں ہو سکی۔ سیاسی مرجعیت نے ان کے دل و دماغ ماؤف کر دیئے تھے۔ وہ ہر چیز کو مفتوحانہ نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ ان کی تبلیغ و تحریر سے دین کے باب میں ایک شکست خوردہ ذہنیت پیدا ہوئی، جس کے اثرات کسی نہ کسی حد تک ایک محدود طبقے میں اب بھی باقی ہیں۔

سید احمد خاں نے اپنے مشن کی تکمیل کے لیے محمدن اینگلو اورٹھیل کالج کی بنیاد رکھی، اور دوسری طرف اس شکست خوردہ ذہنیت کے رد و فصل کے طور پر دیوبند کی درس گاہ قائم ہوئی۔ علی گڑھ اور دیوبند میں صرف دو درس گاہوں کی بنیادیں نہیں رکھی گئیں، بلکہ دو متضاد اور مختلف مکاتب فکر کے مستقل مرکز قائم ہوئے۔ ایک نے مسلمانوں کو علوم ہمدیدہ سے آگاہ کر کے اگر ایک مفید کام کیا، تو اس کے ساتھ ان کو مغرب کی ذہنی غلامی اور عملی تقلید کا روگ بھی لگا دیا۔ دوسرے نے مسلمانوں کی

علمی اور دینی میراث کو بچا کر اگر ایک اہم خدمت انجام دی، تو اس کے ساتھ وہ مسلمانوں کے موروثی جمود کو بھی برقرار رکھنے کا قریب ہوا، اور اس نے دنیا اور زمانے کی ضروریات سے گویا آنکھیں بند کر لیں۔ یہ کشمکش صرف دیوبند اور علی گڑھ، دو مقامات تک ہی محدود نہیں رہی، بلکہ جہاں کہیں بھی نئے اسکول اور کالج قائم ہوئے، انہوں نے سرسید کی پالیسی کو اپنی مشعل راہ بنایا، اور اسی طرح ملک کے جس حصے میں بھی کوئی مدرسہ قائم ہوا، عام جمود اور مسائل حیات سے فرار کی پالیسی میں اس کی روش دیوبند ہی کے نقش قدم پر رہی۔

یہ کشمکش عرصہ تک چلتی رہی، تا آنکہ دونوں قسم کی درس گاہوں سے ایک بڑی تعداد لکھ پڑھ کر ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئی، اور اہل فکر و نظر کو احساس ہوا کہ اگر اس خلیج کو پاٹنے کی فوری کوشش نہ کی گئی، تو اسلامی ہند بالکل دو متضاد اور مخالف گیمپوں میں تقسیم ہو کر رہ جائے گا اور کسی متحدہ جدوجہد کے شروع کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آئیں گی۔

اس احساس نے ندوۃ العلماء کی شکل اختیار کی۔ لکھنؤ میں اس کا دارالعلوم قائم ہوا، اور نصیب تعلیم میں ایسی تبدیلیاں کی گئیں کہ طالب علم علوم دین اور عربی زبان و ادب میں بھارت کے ساتھ ساتھ دنیا اور اس کے مسائل سے بھی بے خبر نہ رہے۔ آگے چل کر اس نے دیوبند اور علی گڑھ کی انتہا پسندی کے درمیان ایک بین بین مسلک اعتدال کی شکل اختیار کر لی۔ اور ملک کے طول و عرض میں ایسی درس گاہیں قائم ہوئیں جو اس کے طریقہ تعلیم و اصلاح سے متاثر تھیں، اور ایسے اہل علم اور اہل قلم تو شمار میں نہیں آسکتے، جو اس کے لیر پھر سے متاثر، فکری اور ذہنی طور پر اس سے قریب اور اس کے تہذیبی رجحان سے ہم آہنگ کہے جاسکتے ہیں۔ ندوہ کی ایک اور خصوصیت ہے — ایک زندہ زبان کی حیثیت سے عربی زبان و ادب کی اہمیت پر زور دے کر اس نے عرب ملکوں سے اپنے تعلقات استوار کیے اور اس کے فارغ التحصیل طلبہ نے ان ملکوں کے مسائل سے ماہرانہ واقفیت بہم پہنچائی اور اپنے ملک کے حالات و مسائل سے ان ملکوں کو روشناس کرایا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ پچھلے دور میں جب کبھی اسلامی ہند کو دنیائے اسلام اور خاص کر عرب ملکوں سے رشتہ الفت استوار

کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے، اسی درگاہ کے تربیت یافتہ کام آتے ہیں، اور آئندہ بھی غالباً یہی اس کام میں آگے ہوں۔

نئے مفکرین | یہ تین مکاتب فکر بیسویں صدی کے ابتدائی حصے تک یہاں پوری طرح پھیلے ہوئے تھے۔ اودھ مسلمان ملکوں میں بے چینی اور اضطراب کی لہر دوڑنے لگی۔ سید جمال الدین افغانی انتقال کر چکے تھے دف ۱۳۱۵ھ۔ لیکن ان کے افکار و خیالات زندہ تھے۔ سلطان عبدالحمید مغرول ہو چکا تھا۔ مگر اس کے ان تھک پر دہکندے کے اثر سے مسلمانان عالم کو عثمانی حکومت سے خاصی وابستگی ہو گئی تھی۔ ترکی انقلاب کے بعد ہی طرابلس اور بلقان میں جنگ اور بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے اور پھر پہلی جنگ عظیم کے شروع ہوتے ہوئے مسلمانان ہند کی محبوب ترکی حکومت برطانیہ و فرانس اور روس کے خلاف میدان جنگ میں کود پڑی۔

ان بین الاقوامی حالات کا ہندوستان میں اسلامی فکر کی نشوونما اور ارتقاء پر گہرا اثر پڑا۔ شہدائے بعد پہلی مرتبہ مسلمانوں میں جاندار سیاسی تحریکیں اٹھیں۔ قدرتی طور پر نئے رجحانات کی قیادت اور نئے افکار کی تربیت و پرورش کے لیے دو نئے مفکر منصفہ شہود پر جلوہ گر ہوئے۔ ایک نے نثر کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور دوسرے نے نظم کو۔ ایک نے کتاب سنت کو اور دوسرا بچھونا بنایا۔ دوسرے نے اسلام کی باطنی روح کو اجاگر کرنے کی کوشش کی میری مراد ابوالکلام اور آقبالؒ سے ہے۔ ابوالکلام کا یہ دور دعوت و جہادِ مسلمہ سے منسلک، بلکہ اس کے کچھ بعد تک قائم رہا۔ اور اس دوران میں ان کے خطبوں اور مقالات سے ہزاروں اور لاکھوں آدمی نہ صرف متاثر ہوئے، بلکہ ان کی زندگیاں بدل گئیں، ان کے سوچنے اور سمجھنے کے سانچے تبدیل ہو گئے۔ مگر آج کل جس نے اپنی غیر معمولی شخصیت اور جہزِ نما تحریر و تقریر سے لاکھوں عیندے کے ماتوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا، اور ہزاروں دلوں میں ایمان کی نجمِ ریزی کی، آہستہ آہستہ خود فکر و عمل کے اس مقام پر پہنچ گیا، جہاں مخلص سے مخلص عقیدت مند کے بیٹے ہی اس کے قول و فعل کی توجیہ مشکل ہو گئی۔

اب تک بے عمل تھی، بد عقیدگی نہیں تھی۔ لیکن حالات سازگار پاکستانی فکر کی بغاوت نے بھی سر اٹھایا یہ مسئلہ کا ذکر ہے۔ اس فکر کی بغاوت کی علمبرداری لکھنؤ کے رسالہ نگار کے حصے میں آئی۔ ساتھ ساتھ انکارِ حدیث کا فتنہ بھی نئے لباس میں ظاہر ہوا۔ اس ”مولودِ ضلیعہ“ کی پرورش بھی ابتدائے نیاز ہی کے نگار خانے میں ہوئی۔ پھر اسے امرتسر میں موافق آب و ہوا نصیب ہوئی اور اس کے بعد دہلی کے ایوانِ حکومت میں اسے مستقل مامن مل گیا۔ جوابِ تقسیم کے بعد پاکستان کے سکرٹریٹ میں منتقل ہو گیا ہے۔ بد قسمتی سے جامعہ ملیہ دہلی کے ایک استادِ رجواشا اللہ خاں دہلوی اہل حدیث اور ایک مشہور اہل حدیث عالم کی یادگار ہیں، عرصہ سے اس کے سرپرست بنے ہوئے ہیں۔ فتنہ نگار اور فتنہ انکارِ حدیث کی بیخ کنی کے سلسلے میں جن بزرگوں نے بیش بہا خدمات انجام دیں اور ساہا سال تک سنتِ نبوی کے دفاع اور تحفظ کے لیے سینہ سپر رہے، ان میں مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالمجید دہلوی کے نام ممتاز و نمایاں ہیں۔

تحریکِ خلافت کے اثر سے جو مذہبی بیداری پیدا ہوئی تھی، اس کی عمر بہت تھوڑی ثابت ہوئی۔ وہ ایک جذباتی تحریک تھی اور کسی واضح فکر سے محروم۔ اس لیے جوں ہی وہ مخصوص نفسیاتی حالات بدے، عارضی دینداری بھی ختم ہو گئی اور مذہبی بغاوت کی روح جاگ اٹھی، جیسا کہ ابھی ہم اشارہ کر چکے ہیں۔

اتنے میں ملک کے سیاسی حالات تیزی کے ساتھ بدلنے لگے۔ ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت انڈین نیشنل کانگریس، جس میں آزادی پسند ہندو اور مسلمان سب جمع تھے دیکھتے دیکھتے ہندو قوم پرستی کی علم بردار بنتی چلی گئی اور اس کے اس رویے سے مسلمانوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ ان میں سے ایک گروہ کانگریس کی اس روش کے باوجود اس سے چٹا رہا اور اس نے متحدہ قومیت کا ایک نیا نظریہ اختیار کر لیا۔ دوسرا گروہ پہلے مسلم کانفرنس اور پھر مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے مسلم قومیت، کا علمبردار بنا۔ دونوں گروہوں کے درمیان ایک نہ ختم ہونے والی کشمکش کا آغاز ہو گیا۔ متحدہ قومیت کے ماننے والے ایک پنج میل مشترک تہذیب اور مشترک قومیت کے

گن گاتے تھے، جس کے نتیجے میں وطن پرستی کا جذبہ زور پکڑ رہا تھا اور اکبری دور کی ہندو اناجہیت کی طرف مسلمانوں کے پھر لپٹ جانے کی راہ ہموار ہو رہی تھی۔ دوسری طرف مسلم قومیت کے علم بردار مسلم تہذیب اور مسلم نسل و قومیت کی بنیاد پر ایک نئی تحریک اٹھا رہے تھے، جس میں بظاہر تو اسلام سے وابستگی کا ایک خوشگوار رجحان پایا جاتا تھا، مگر اس کی رفتار صاف بتا رہی تھی کہ یہ تحریک اسلام کی آئینہ یا لوجی کی طرف جانے کے بجائے تیزی کے ساتھ ٹرکی، ایران اور مصر کی طرح محض ایک آزاد مسلم قوم وجود میں لانے کی طرف جا رہی ہے۔ وطن پرستی اور مسلم قوم پرستی کی یہ کشمکش دن بدن بڑھتی چلی گئی اور مسلمانوں کی وحدت کا شیرازہ منتشر ہونے لگا۔ اس سلسلے کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ عالمانِ دین کی نمائندہ "جمعیت" نیشنل کانگریس اور اس کی پالیسی کے پر جوش ہم نواؤں میں شامل ہو گئی اور شدت کے ساتھ اپنے مسلک پر قائم رہی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم قومیت کی نو خیز تحریک، جس کی لیڈر شپ میں دین کے علم اور دینی رجحانات کی پہلے ہی بہت کمی تھی، علماء سے برسرِ جنگ ہو گئی اور اس چیز نے صرف علماء ہی کا استغفاف نہیں کر لیا، بلکہ ان کے ساتھ علمِ دین اور دین کے اثر کو بھی سخت نقصان پہنچایا۔ وطن پرستی اور مسلم قوم پرستی کی یہ آویزش جانے کہاں جا کر دم لیتی، اگر اس کے خلاف اسلام اور دین حق کی بے لاگ آواز بلند نہ ہو جاتی۔ ایک درمند صاحبِ علم نے آنے والے حالات کا بروقت اندازہ لگالیا تھا، اور ۱۹۳۳ء میں حیدر آباد دکن سے رسالہ ترجمان القرآن جاری کر کے دعوتِ حق کے لیے زمین ہموار کرنا شروع کر دی تھی۔ ابتدائی چار پانچ سال افکار و خیالات کی تنقیح اور اسلامی فکر و دین کے متعلق گونا گوں غلط فہمیوں کے ازالے میں صرف ہوئے۔ ابھی یہ تنقید و تنقیح کا کام جاری تھا کہ ۱۹۳۷-۳۸ء میں ہندوستانی وطن پرستی اور مسلم قوم پرستی کی کشمکش طوفانی شکل اختیار کرنے لگی اور وقت آگیا کہ اسلام کی سچی اور بے میل دعوت ایک مرتبہ پھر دنیا کے سامنے پیش کر دی جائے۔ اس موقع پر مدیر "ترجمان" نے پہلے ہندوستانی وطن پرستی کی بیخ کنی ضروری سمجھی اور آج صرف موافق ہی نہیں، مخالف بھی یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ اگر ترجمان القرآن

کے بے پناہ مقالات نہ ہوتے تو متحدہ قومیت کا جنازہ نکلنا آسان نہ تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستانی قومیت کے خلاف ترجمان القرآن کے مسلسل حملوں سے مسلم لیگ اور مسلم قومیت کی تحریک کو بڑی تقویت پہنچی اور ان مضامین کو گھر گھر پھیلانے میں لیگی حضرات نے پورا تعاون کیا۔ مگر جوں ہی اس مہم کی دوسری منزل سامنے آئی اور مدیر ترجمان القرآن نے مسلم قومیت کی کمزوریاں اور اس کے علم برداروں کی بے اعتدالیاں دکھانا شروع کیں اور اسلام کی راہ راست سے ان کا انحراف، عام مسلمانوں پر واضح کیا، تو پھر اس غریب سے زیادہ بُرا کوئی نہ تھا! گو با اسلام سے محبت نہیں، اپنی قومیت اور عادات و رسوم و رواج زیادہ محبوب ہیں۔ جب تک شرک خالص کی مذمت کی جائے سبحان اللہ اور ماشاء اللہ کے نعرے بلند ہوں، اور جہاں ان جاہلی رسوم اور عادات کی نشان دہی کی جائے جو اسلامی سوسائٹی میں راہ پاگئی ہیں، تو جبین نازیہ نشکینیں پڑ پڑ جائیں۔ یہ طالبانِ حق کا شیوہ نہیں، یہ تو بگڑی ہوئی قوموں کے لچھن ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مدیر ترجمان القرآن نے ہندوستانی قومیت کی پیخ کنی سے فارغ ہوتے ہی فوراً اپنی کوششوں کا رخ صاف اور بے لاگ اسلام کی دعوت کی طرف موڑ دیا، تاکہ مسلم قومیت کی تحریک کو اتار کر اسی کی طرف جاتے ہوئے روکا جائے اور مسلمانوں میں زندگی کی جو نئی حرکت پیدا ہوئی ہے، اُسے اقامتِ دین کے لیے استعمال کیا جاسکے۔ یہ کوئی نئی دعوت نہ تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر سید المرسلین و خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء اسی کی دعوت دیتے آئے ہیں اور ان کے بعد امت کے تمام مصلحین کے پیش نظر یہی چیز رہی ہے۔ مگر آپ کو معلوم ہے کہ اسلام کی بے لاگ دعوت کا خود اس کے دم بھرنے والوں نے کبھی ٹھنڈے دل سے استقبال نہیں کیا ہے۔ یہ کل کا واقعہ ہے، اور آج بھی ہماری آنکھوں کے سامنے یہ نیزنگیاں ظہور میں آرہی ہیں۔ اس لیے اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔

۳۹ سے ۴۰ تک مدیر ترجمان القرآن انفرادی طور پر اللہ کے دین کی طرف

بلاتے رہے اور اقامت دین کی منظم جدوجہد کے لیے لوگوں کو آمادہ عمل کرتے رہے۔ جن نیک اور باہمت بندوں نے پہلے پہل اس دعوت کا خیر مقدم کیا اور صدائے لبیک بلند کی، انہوں نے سلسلہ میں اپنے کو ایک 'اسلامی جماعت' کی صورت میں منظم کر لیا۔ اور مدیر ترجمان القرآن بالاتفاق اس کے امیر منتخب ہوئے۔

سلسلہ سے سلسلہ تک مسلسل جدوجہد اور دعوت کی سرگرمیوں کا زمانہ تھا۔ صحیح معنوں میں ہندوستان کی تاریخ میں یہ دوسری اسلامی تحریک تھی جو صحیح لائنوں پر شروع کی گئی۔ اس کے نصب العین، طریق کار اور پروگرام پر خاصہ لٹریچر موجود ہے جسے پڑھ کر اس کی صحیح اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اس جماعت نے پوری کوشش کی کہ مسلمان اقامت دین کے نصب العین پر جمع ہو جائیں، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ مسلم قوم پرستی اور ہندو وطن پرستی کی کشمکش اپنی راہ پر بڑھتی رہی اور اس کا انجام بڑے بڑے ہندوؤں کے اندر دوسرے ملکوں کی پیدائش میں رونما ہوا۔ ایک بھارت جہاں سیاسی اقتدار مکمل طور پر ہندوؤں کے ہاتھ میں چلا گیا اور وہاں کے مسلمان پوری طرح مغلوب ہو گئے۔ دوسرے پاکستان جہاں سیاسی اقتدار مکمل طور پر مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گیا اور سابق ہندوستانی مسلم قوم کے نصف سے کچھ زائد حصے کو یہ اختیارات حاصل ہو گئے کہ اگر وہ اسلام کو نہ کرنا چاہے تو کر سکتی ہے۔ اس تقسیم کے بعد اسلامی تحریک کی علم بردار جماعت بھی تقسیم ہو گئی۔ اس کے جو کارکن تقسیم کے وقت بھارت میں تھے، وہ ایک الگ جماعت بن گئے، اور آج جس تن دہی اور ثابت قدمی کے ساتھ انتہائی نامساعد حالات میں وہ دعوتِ حق کا فرض انجام دے رہے ہیں، وہ ہم پاکستانی مسلمانوں کے لیے قابل رشک ہے۔ اللہ کی شان کہ جو علمائے دین بڑے بڑے آستانوں کے مند نشین ہیں، ان کی آنکھیں تو متحدہ قومیت کے بدترین نتائج دیکھنے اور بھگت لینے کے بعد بھی نہ کھلیں، بلکہ وہ اس سے بھی بڑھ کر ایک شدید تر ضلالت، یعنی لادینی رسیکو لزم، کے حامی بن گئے، مگر جن لوگوں کے سر کسی واراعہ

کی دستاویزیلیت سے عزیز نہیں ہیں، وہ آج بھی سرزمین ہند میں وطن پرستی اور سیکولرزم کی تردید کر رہے ہیں اور نظام حق کے قیام کی دعوت دیتے جا رہے ہیں۔ پھر اس سے بھی زیادہ ستم ظریفی یہ ہے کہ دینی آستانوں کے مسند نشینوں کو ان سرفروش ہندو گان حق کی جراثیم دیکھ کر شرم تو کیا آتی، وہ آج آٹے اس بات پر پٹتے ہوئے ہیں کہ اُس ایک آواز کو بھی بند کر دیں جو بھارت میں حق کے لیے بلند ہو رہی ہے۔ کیونکہ اس کے بلند ہونے سے انہیں اپنی مذہبی ساکھ کے گر جانے کا اندیشہ ہے۔ تاریخ میں یہ عجوبہ بھی یادگار رہے گا۔ کہ متحدہ قومیت اور لادینی جمہوریت کے علمبردار تو قرار پائے ہیں مسلمان، اور ان کے دارالافتادوں سے گمراہی اور بے دینی کے فتوے جاری ہو رہے ہیں اُن لوگوں کے حق میں جو آج اس انتہائی خطرناک دور میں بھی بھارت کی مسلم اور غیر مسلم آبادی کو اسلامی نظام زندگی کی طرف دعوت دینے سے نہیں چوکتے۔

یہ تو ہے بھارت کی اسلامی تحریک کا حال۔ رہا پاکستان، تو یہاں تقسیم کے بعد جماعت اسلامی پاکستان کے نام سے ایک الگ نظام جماعت بن گیا۔ اور اس نے حال و مقام کی مناسبت سے ایک دوسرا پروگرام اختیار کیا۔ یہاں ایک مسلم قوم آباد ہے اور اسے حاکمانہ اختیارات حاصل ہیں اس لیے یہاں کی جماعت نے تقسیم کے بعد تارکان وطن اور پناہ گزینوں کی امداد و خدمت کے کام سے فارغ ہوتے ہی مطالبہ نظام اسلامی کی مہم شروع کر دی، جو ارباب اقتدار کی تمام ناراضگیوں کے باوجود جاری رہی اور آخر اس مطالبہ کی مہم نے انہیں قرار و مقاصد پاس کرنے پر مجبور کیا، جو اصل میں اس ریاست کے مسلمان ہونے کا باضابطہ اعلان تھا۔

قرار و مقاصد کے بعد جماعت کا کام دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک طرف وہ عام دعوت اور منظم تبلیغ و تلقین سے معاشرے کی ذہنی و اخلاقی اصلاح کرنے میں لگی ہوئی ہے، تاکہ اسلامی قانون کے نفاذ و اجراء کے لیے مناسب و موزوں فضائیہ ہو۔ دوسری طرف وہ قرار و مقاصد کے نفاذ کے مطابق نظام حکومت کی اصلاح کے لیے کوشش کر رہی ہے، تاکہ حکومت کا دستور بھی اسلامی ہو اور ملک کا قانون بھی اسلامی۔ اور پھر اس پر عمل درآمد کرنے کے لیے ایسے لوگ ملک میں برسرِ اقتدار

آئیں جن کی ذہنیت اور سیرت بھی اسلامی ہو۔ اس کام میں جو طبقے جماعت اسلامی کی مزاحمت کر رہے ہیں، ان میں سے مغرب زدہ طبقے کی مزاحمت ہماری سمجھ میں آتی ہے، کیونکہ اسلامی نظام کا قیام ہر کے طوائف نظر مایت اور ان کی فاسقانہ عادات کے خلاف ہے۔ انٹرنر کی گروہ کی مزاحمت بھی ہماری سمجھ میں آتی ہے، کیونکہ جہاں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ جاری ہو گا، وہاں مارکس اور لینن کا طریقہ جاری نہ ہو سکے گا۔ گمراہ فرقوں کی مزاحمت بھی ہماری سمجھ میں آتی ہے، کیونکہ ان میں سے ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ اُس کے فروع کا امکان اُسی وقت تک ہے جب تک یہاں کتاب و سنت سے بے نیاز ہو کر کام کرنے والی ایک فاسق قیادت موجود ہے۔ لیکن اگر کوئی مزاحمت ہماری سمجھ میں نہیں آتی تو وہ اُن علماء کرام کی مزاحمت ہے جو خود کہتے ہیں کہ شریعت کی فرمانروائی انہیں مطلوب ہے، خود کہتے ہیں کہ فسق و فجور کا یہ طوفان انہیں گوارا نہیں ہے، مگر جب اسی مقصد کے لیے جماعت اسلامی آگے بڑھ کر جدوجہد کرتی ہے تو وہ ہر ممکن طریقہ سے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کی ساری ہمدردیاں اُس فاسق قیادت کے ساتھ ہوتی ہیں جو یہاں اس وقت ہر منکالت اور ہر فسق کی پشت پناہ بنی ہوئی ہے۔ اس طرزِ حمل کی وجہ کیا ہے؟ یہ سوال ہم سے اکثر پوچھا جاتا ہے۔ مگر ہمیں اس کا کوئی جواب معلوم نہیں ہے۔ شاید یہ راز اس دنیا میں واز ہی رہے گا، مگر ایک دن بر حال آئے جس میں سارے ہی رازوں سے پردہ اُٹھ جائے گا۔

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَلَا نَاصِرٍ ط

● امن عالم کا عضو ● فلاح انسانیت کا پیغامبر ● پورے ہندوستان میں اپنی نوعیت کا واحد اخبار

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

یوپی - بھارت

الافصاف آپ کا بہترین رفیق ثابت ہوگا۔ خود پڑھیے دوسروں کو پڑھاویئے۔

زیر تعاون سالانہ ششماہی ہے۔ یہاں ہی ملے۔ پتہ۔ ذکر الاتصاف ۳۵۱ شائع
الہ آباد میں ہے۔